Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

TITLE OF THE PAPER

An Analytical Study of Muhammad Hafeez Khan's Novel *Anwasi* with Reference to Punjabi Culture and Women's Rights

محمد حفیظ خان کے ناول ”انواسی“ کا پنجابی ثقافت اور حقوقِ نسواں کے تناظر میں ایک مطالعہ

AUTHORS

Muhammad Asif Mumtaz
PhD Scholar, Department of Urdu
Lahore Garrison University, Lahore
Dr Munazza Munawar
Assistant Professor, Department of Urdu
Lahore Garrison University, Lahore

ABSTRACT

This research examines Anwasi written by Muhammad Hafeez Khan with special reference to Punjabi culture and the discourse of women's rights. The novel offers a detailed picture of rural Punjabi life by portraying its customs, traditions, social relationships, language, and cultural practices. Through the experiences of different characters, the writer presents the social realities and difficulties faced by people living in a male-dominated society. A major focus of this study is the role and condition of women as depicted in the novel. It investigates the emotional, social, and financial hardships encountered by female characters and highlights issues such as inequality, cultural pressures, restricted independence, and traditional expectations imposed upon women. Despite these limitations, the novel portrays women as strong individuals striving for self-respect, recognition, and fundamental rights. The study also evaluates the narrative style and language of the novel, particularly the effective incorporation of Punjabi vocabulary into Urdu prose. This linguistic combination enhances the originality and cultural atmosphere of the text. Furthermore, the use of local idioms, folk elements, and depictions of village life contributes to the realism and richness of the narrative.

KEY WORDS

Muhammad Hafeez Khan, Urdu Novel, Punjabi Culture, Feminism, Tradition, Rural Life

JOURNAL PROFILE

Noor-e-Tahqeeq is a quarterly, HEC "Y" Category research journal of Lahore Garrison University, publishing peer-reviewed studies in Urdu language and literature since 2017. It provides a credible platform for original research and contemporary criticism.

CONTACT

Dr Muhammad Haroon Qadir
Editor, Noor e Tahqeeq
Department of Urdu
Lahore Garrison University, Lahore 0303-3330345

Email

lgunt@lgu.edu.pk

Website

https://ojs.lgu.edu.pk/nooretahqeeq

ISSUE DETAILS

Volume 10, No 01
Jan to March 2026
Page No: 67-82

DOI

https://doi.org/10.54692/nooretahqeeq.2026.100139

HISTORY OF THE PAPER

Received on: Jan 30, 2026
Accepted on: Feb 27, 2026
Published on: Mar 30, 2026

PUBLISHED BY

Department of Urdu,
Lahore Garrison University
DHA Phase 6, Sector C,
Avenue 4, Lahore

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

محمد حفیظ خان کے ناول "انواسی" کا پنجابی ثقافت اور حقوقِ نسواں کے تناظر میں ایک مطالعہ

ناول اصنافِ نثر میں ایک اہم صنف ہے۔ جس میں کسی خاص نقطہ نظر کے تحت زندگی کی حقیقی اور واقعی عکاسی کی جاتی ہے۔ ناول انسان کے باطنی اور خارجی تصادم کا ایک مسلسل نثری قصہ ہے جو قدیم انسانوں کی بہ نسبت ہماری زندگی کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ اردو ناول کا دامن تاریخی ارتقا اور پختگی کے ساتھ ساتھ موضوعاتی تنوع سے بھی مالا مال رہا ہے۔ اس لیے اظہار و ابلاغ کے راستوں کو اردو ناول نے بہت وسعت عطا کی ہے۔ پنجاب کی ثقافت ایک تاریخی، جغرافیائی اور مذہبی لحاظ سے متنوع خطہ ہے، اردو ناولوں میں ہمیشہ ایک متحرک اور اہم موضوع رہی ہے۔ موجودہ دور کے ناولوں میں نہ صرف تاریخی اور سماجی حقیقتوں کو پیش کیا گیا ہے بلکہ ان میں خواتین کی حالت، ان کے حقوق اور سماج میں ان کی جگہ پر بھی گہری توجہ دی گئی ہے۔ تانیثیت کے نقطہ نظر سے یہ ناول خواتین کے کردار کو ایک نئے زاویے سے پیش کرتے ہیں جہاں ان کے سماجی مقام اور خود مختاری پر سوالات اٹھائے جاتے ہیں۔ موجودہ ناول مردوں کی اجارہ داری اور عورتوں کی ازادی کے درمیان توازن یا خواتین کے اندر طاقت کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔

کسی بھی خطے کی تہذیب اور معاشرت کی اصل بنیادوں کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ شہروں کے بجائے دیہی علاقوں کا رخ کیا جائے، کیونکہ تہذیب کے ابتدائی آثار عموماً وہیں سے سامنے آتے ہیں۔ ڈی ڈی کوسمبی بھی جب ہندوستانی تہذیب کا تاریخی تناظر میں جائزہ لیتے ہیں تو دیہی معاشرت کو شہری زندگی پر فوقیت دیتے ہیں، اس لیے کہ ان کے نزدیک ہندوستانی تہذیب کی جڑیں دیہات ہی میں پیوست ہیں۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> "معاشرت کی مختلف تہوں میں قدیم اوضاع و اطوار کے ایسے باقیات موجود ہیں جن کی مدد سے قبل کے کلیتاً متنوع معاشرتی مدارج کا خاکہ از سرنو مرتب کیا جاسکتا ہے۔ معاشرے کے ان قدیم وجدید مدارج طبقات کو پانے کے لیے شہروں کو چھوڑ کر دیہی علاقوں میں جانا ضروری ہے۔"(1)

شہری تہذیب کے اثرات اب دیہی علاقوں تک بھی پہنچ چکے ہیں۔ سائنسی اور تکنیکی ترقی نے قصباتی اور دیہاتی زندگی کے سماجی روّیوں اور اقدار میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ مواصلات اور ذرائع آمد و رفت میں بہتری کے باعث شہر اور دیہات کے درمیان فاصلہ بتدریج کم ہوتا جا رہا ہے، اور دنیا ایک عالمی گاؤں کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ اس کے باوجود دیہی معاشرے میں روایتی اقدار اور رسم و رواج کی پابندی

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

اب بھی مضبوط ہے۔ وہاں کے لوگ اپنے آباؤ اجداد کے طریقوں سے ہٹنا ناپسند کرتے ہیں اور اسے بے ادبی یا ان کی روایت سے انحراف سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید سہولتوں جیسے ریڈیو، ٹی وی اور دیگر ذرائع کی موجودگی کے باوجود دیہات میں روایتی رسوم و قیود پر بڑی حد تک عمل جاری ہے۔ اس فرق کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی کتاب "دائرے اور لکیریں" میں بھی روشنی ڈالی ہے۔

> "وقت کی مسلسل یلغار کے آگے مشکل ہی سے کوئی دیوار ٹھہر سکتی ہے۔ لہٰذا ہر گاؤں داخلی اور خارجی اعتبار سے مسلسل متغیر کی زد میں آکر تبدیل ہوتا رہتا ہے مگر تمام تبدیلیوں کے باوجود ہر گاؤں کے عقب میں ایک گاؤں بغیر کسی تبدیلی کے سدا موجود رہتا ہے۔"(2)

ادیب اپنے معاشرے کا عکاس ہوتا ہے اور اس کی تحریر خواہ وہ کسی بھی صنفِ ادب سے تعلق رکھتی ہو وہ اپنے عہد کی آواز ہوتی ہے جو بلند آہنگ سے اپنے عہد کے لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں سے آنے والی نسلوں اور زمانوں کو روشناس کراتی ہے۔ چونکہ ادیب اپنے معاشرے، اپنے عہد، اپنے حال اور ماضی پر گہری نظر رکھتا ہے۔ وہ انسانی زندگی کے ہر پہلو کا نہایت باریک بینی سے مشاہدہ کرتا اور اپنی ذات کو بھی اس کے ساتھ ہم آہنگ کر کے اس کی زندگی کا حصہ بن جاتا ہے۔ اس طور پر ہم ادب کو بھی ماضی حال اور مستقبل کے خانوں میں بانٹ کر دیکھ سکتے ہیں۔

محمد حفیظ خان اردو اور سرائیکی کے نمایاں ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی ہمہ جہت شخصیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار، ڈرامہ نگار، کالم نگار، مترجم، نقاد اور مؤرخ کے طور پر اپنی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ افسانہ اور ناول لکھنے کے ساتھ ساتھ شاعری سے بھی وابستہ ہیں، تاہم انہوں نے ریڈیو کے لیے سرائیکی ڈرامے بھی تحریر کیے۔ اگرچہ ان کی اصل شناخت ایک سرائیکی ادیب کی ہے، لیکن انہوں نے اردو زبان میں بھی ناول تخلیق کیے ہیں۔ محمد حفیظ خان عصرِ حاضر کے اہم ناول اور افسانہ نگاروں میں ایک معتبر نام ہیں۔ ان کا ناول "انواسی" ان کی دوسری تخلیق ہے، جس کا پہلا ایڈیشن جون 2019ء اور دوسرا ایڈیشن دسمبر 2019ء میں شائع ہوا۔ اتنے کم عرصے میں دوسرے ایڈیشن کی اشاعت اور اس کی بھرپور مقبولیت اس ناول کی ادبی اہمیت اور قارئین میں اس کی پذیرائی کا واضح ثبوت ہے۔

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

یہ ناول جنوبی پنجاب کے سرائیکی وسیب، خاص طور پر لودھراں اور بہاولپور کے درمیان بہنے والے دریائے ستلج کے کنارے واقع بستی آدم واہن کی کہانی بیان کرتا ہے۔ اسے 45 حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور اس میں 1872ء سے 1875ء تک کے دور کی گمشدہ تاریخ کو پیش کیا گیا ہے۔ ناول کا انتساب بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے خاصا منفرد اور معنی خیز ہے۔

لفظ "انواسی" دراصل سنسکرت سے اردو میں شامل ہوا ہے اور اس سے مراد ایسی لڑکی یا عورت لی جاتی ہے جس کی عصمت دری ہو چکی ہو یا جو کنواری نہ رہی ہو۔ بعض افراد اس لفظ کی ایک مختلف تشریح بھی پیش کرتے ہیں کہ سرائیکی میں "واسی" مقامی لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، لہٰذا "انواسی" سے مراد غیر مقامی افراد ہیں۔ تاہم، اس لفظ کا مقامی یا غیر مقامی ہونے کے تصور سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ زیرِ مطالعہ ناول "انواسی" اپنی منفرد طرزِ بیان، کرداروں کی تشکیل اور دیگر فنی خصوصیات کے ساتھ ساتھ فکری اعتبار سے بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس ناول میں بیک وقت کئی اہم پہلو یکجا ہو گئے ہیں۔ "انواسی" میں مختلف گمشدہ اور کڑوی حقیقتوں کی عکاسی کی گئی ہے، جبکہ اس کی مجموعی فضا میں مخصوص ثقافتی رنگوں کے ساتھ سیاسی، سماجی اور تاریخی آگاہی بھی نمایاں ہے۔ خاص طور پر جنوبی پنجاب، بالخصوص بہاولپور کی ثقافت اس میں واضح طور پر جھلکتی ہے۔

ناول کی کہانی دریائے ستلج کے کنارے واقع بستی آدم واہن کے گرد گھومتی ہے، جہاں کے باسیوں کے ذریعے مصنف نے ایک پوری تہذیب کے المیے کو نمایاں کیا ہے۔ ان لوگوں کی زندگی کا دائرہ زیادہ تر روزی روٹی تک محدود ہے؛ وہ دو وقت کے کھانے کو ہی اپنی بنیادی ضرورت اور مقصد سمجھتے ہیں اور اسی پر مطمئن رہتے ہیں۔ دریا ان کے لیے معاش کا اہم ذریعہ ہے، جہاں سے وہ مچھلیاں پکڑ کر اپنی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ اس معاشرے میں جرائم کی دو نمایاں صورتیں پائی جاتی ہیں: رسہ گیری یعنی چوری، اور بازو نکالنا یعنی لڑکیوں کا اغوا۔ مویشی بھی دریائی بستیوں کی معیشت میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ لڑکیوں کے اغوا کو کوئی بڑا جرم نہیں سمجھا جاتا، اور جاگیردار و زمیندار اپنی مرضی سے اس عمل میں ملوث رہتے ہیں، جس کے خلاف آواز اٹھانے کی روایت تقریباً ناپید ہے۔ یہ معاشرہ لڑکیوں کے تحفظ میں ناکام دکھائی دیتا ہے، اسی لیے والدین جلد از جلد ان کی منگنی یا شادی کر کے اپنی ذمہ داری پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ناول میں اس سماج کی ایسی تصویر پیش کی گئی ہے جہاں عورت کا اغوا ہو جانا یا کسی کے ساتھ چلے جانا معمول کی بات بن چکی ہے، اور یوں غیرت و اقدار کی پامالی ایک عام منظر کے طور پر سامنے آتی ہے۔

ناول نگاری کے میدان میں محمد حفیظ خان نے پنجابی معاشرے اور اس کی ثقافتی جھلک کو مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ کہانی کا مرکز دریائے ستلج کے کنارے واقع ایک بستی، آدم واہن، ہے۔ اس بستی کے کرداروں کے ذریعے مصنف نے ایک وسیع تہذیبی سانحے کو بیان کیا ہے۔ دریا پر پل کی تعمیر کے سلسلے میں موجود انگریز کرداروں کے توسط سے سامراجی نظام کی حقیقت بھی واضح کی گئی ہے۔ناول میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح استعماری قوتیں محکوم عوام کی جان و مال کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف اپنے مفادات کو ترجیح دیتی ہیں۔ وہ اپنی حکمرانی کو مضبوط بنانے کے لیے مختلف طریقے اختیار کرتی ہیں اور مقامی لوگوں کی مجبوریوں اور کمزوریوں کا فائدہ اٹھا کر انہی میں سے کچھ افراد کی وفاداریاں خرید لیتی ہیں، جو ان کے اقتدار کو مزید تقویت دیتی ہیں۔ یہی تمام پہلو ناول کے بنیادی موضوعات میں شامل ہیں۔

کہانی کا آغاز بھی اسی پس منظر میں ہوتا ہے، جہاں انگریز حکومت دریائے کنارے آباد آدم واہن کے رہائشیوں کے ساتھ ٹکراؤ کی حالت میں نظر آتی ہے۔ کمپنی کی جانب سے ریلوے لائن بچھانے کا کام جاری ہے، مگر اس دوران ایک بڑا مسئلہ اس وقت سامنے آتا ہے جب گاؤں کا پرانا قبرستان اس منصوبے کی زد میں آ جاتا ہے۔ اس صورتحال پر بستی کے لوگوں کا شدید ردعمل سامنے آتا ہے اور وہ کسی بھی صورت میں اس اقدام کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اگرچہ وہ اس بات سے آگاہ ہیں کہ انگریز طاقتور ہیں، مگر ان کے مذہبی عقائد اور جذبات اس خوف پر غالب آ جاتے ہیں۔ خاص طور پر جب معاملہ مذہب اور بزرگوں کی حرمت کا ہو تو وہ جان کی قربانی دینے کو تو تیار ہیں، مگر اپنے عقیدے پر سمجھوتہ نہیں کرتے۔ کچھ افراد اگرچہ خوفزدہ بھی ہیں، لیکن اکثریت مزاحمت کے حق میں کھڑی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے برعکس، چند لوگ یہ رائے بھی دیتے ہیں کہ قبروں کو دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے تاکہ بزرگوں کی یادگار کسی نہ کسی صورت باقی رہ سکے:

> "مٹھل ماچھی نے مشورہ دیا کہ کیوں نہ ہم اپنے وڈکوں کی ہڈیاں نکال کر کہیں اور قبریں بنا لیں۔
> مٹھل ماچھی کے منصوبے پر مولوی جار اللہ نے یہ کہہ کر رندہ پھیر دیا کہ ایسا کرنا میت کی توہین، صریحاً کفر اور گناہِ کبیرہ ہے۔ اب مولوی کے فتوی کے بعد کسی کی مجال کہ کوئی اختلاف کرے لہٰذا وہاں بیٹھے ہوئے سب نے چپ سادھ لی۔"(3)

کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ معاشرتی رسم و رواج اور طرزِ زندگی کے اثرات مذہبی پہلوؤں پر غالب آ جاتے ہیں۔ جب ثقافتی اور مذہبی عناصر آپس میں ملتے ہیں تو ان سے پیدا ہونے والے جذبات اور عقائد اس قدر مضبوط ہو جاتے ہیں کہ وہ دیگر تمام عوامل پر فوقیت حاصل کر لیتے ہیں:

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

> ”مسلمان اپنی معاشرت کے شعائر کو مقدس مانتے تھے کیونکہ ان کی اساس اسلامی عقیدوں پر تھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی مدِ نظر تھا کہ دوسروں کی معاشرت کی تقلید کا مطلب ان کے غلبے کو تسلیم کرنے کو مترادف اور ان کی معاشرت کو حقیر اور غیر معیاری مان لینے کے برابر ہو گا اور یہ انگریزوں کے تسلط کو مستحکم کرنے کا باعث ہو گا۔“(4)

اسی نوعیت کی کیفیت ناول میں اس وقت ابھرتی ہے جب مقامی لوگ قبرستان میں موجود چالیس درویشوں سے وابستہ قبروں کے مسئلے پر شدید ردِ عمل دکھاتے ہیں۔ اگرچہ دیگر قبریں بھی اہمیت رکھتی تھیں، لیکن ان درویشوں کے ساتھ وابستگی غیر معمولی نوعیت اختیار کر چکی تھی۔ ان قبروں کی تقدیس صرف مسلمانوں تک محدود نہیں تھی بلکہ مختلف مذاہب کے ماننے والے بھی ان سے عقیدت رکھتے تھے، اسی لیے کوئی بھی ان کی بے حرمتی یا منتقلی کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ مزید برآں، ناول میں اس مقام پر لگنے والے میلوں کا ذکر بھی ملتا ہے جہاں مختلف مذاہب کے لوگ اکٹھے ہوتے تھے۔ ہندو انہیں اپنا رہنما تصور کرتے، مسلمان روحانی پیشوا مانتے، جبکہ دیگر مذاہب کے پیروکار بھی اپنی عقیدت کا اظہار کرتے تھے۔ اس طرح مذہبی اور ثقافتی عناصر کے امتزاج نے ایک مضبوط جذباتی فضا پیدا کر دی تھی، جو بسا اوقات شدت اختیار کر کے مسائل کو جنم دیتی اور عام لوگوں کے استحصال کا سبب بھی بنتی ہے۔ جب مذہبی اور سماجی عقائد آپس میں گُھل مل جائیں تو وہ ایک ایسی شدت پیدا کرتے ہیں جس کے آگے مزاحمت کرنا گویا تیز بہاؤ کے سامنے کمزور بند باندھنے کے مترادف ہوتا ہے۔ بستی اور اس کے گردونواح میں مختلف مسالک کے لوگ آباد تھے، جن میں مولوی جار اللہ بھی شامل تھا، جو ان افراد کو ناپسند کرتا تھا جو ہر سال زندہ پیر کرامت کے عرس میں شریک ہوتے تھے۔ دوسری جانب انگریز حکمرانوں کی سختی بھی نمایاں تھی، جنہوں نے اپنے منصوبے میں کوئی تبدیلی نہ کی اور بالآخر بستی کا قبرستان مسمار کر دیا۔ جب مذہبی عقائد کو ٹھیس پہنچتی ہے تو لوگ نہ صرف قربانی دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں بلکہ اس جذبے کو عملی شکل دینے سے بھی گریز نہیں کرتے:

> ”شہیدوں کی قبروں کے ساتھ اس قسم کا سلوک بھی ہو سکتا ہے۔ افسوس کی بات تو یہ تھی کہ جن بستی والوں کو دریائے ستلج کے ہر سال عذاب سے بچانے کے لیے شہیدوں نے یہاں دفن ہونے کی وصیت کی تھی انہی شہیدوں کی قبروں کی حفاظت نہیں کی گئی۔ درویش دہائی دے رہے تھے کہ

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

اگر واقعی شہیدوں کی قبروں کی بے حرمتی کی گئی ہے تو اس میں اب آدم کا ٹھکانہ ممکن نہیں رہا ان کے نزدیک شہیدوں کی قبروں کی حفاظت نہ کر سکنا بھی ان کی بھی حرمتی ہی تھی۔"(5)

یہ بات درست ہے کہ مولوی جار اللہ میں انگریزوں کے خلاف کھل کر مزاحمت کرنے کی ہمت موجود نہ تھی، مگر بنیادی مسئلہ اس کا طرزِ عمل تھا۔ اس نے اپنی مذہبی حیثیت کو اس انداز میں استعمال کیا کہ بالواسطہ طور پر انگریزوں کے ساتھ وفاداری نبھاتے ہوئے عام لوگوں کے مفادات کو نقصان پہنچایا۔ بستی میں اس کی ایک مضبوط ساکھ تھی، جسے اس نے مناسب انداز میں استعمال کرنے کے بجائے ذاتی اور مفاداتی مقاصد کے لیے بروئے کار لایا۔ یہاں تک کہ بیس نوجوانوں کی ہلاکت جیسے سانحے کے باوجود، اس نے لوگوں کی سوچ کو اس طرح متاثر کیا کہ وہ مزاحمت کے بجائے مزید دباؤ اور بے بسی کا شکار ہو گئے۔ مولوی جار اللہ نے اپنے مذہبی مقام کو استعمال کرتے ہوئے موقع کی مناسبت سے فتوے جاری کیے اور انہیں اپنے اور انگریزوں کے مفادات کے حصول کے لیے استعمال کیا۔ اس طرزِ عمل نے نہ صرف کئی افراد کو نقصان پہنچایا بلکہ مذہب کی غلط تعبیر اور اس کے منفی استعمال کی ایک واضح مثال بھی پیش کی۔

کوئی بھی ادیب اپنی تحریر کو مؤثر بنانے کے لیے تاریخ، تہذیب اور ثقافت کی گہرائی تک رسائی حاصل کر کے معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ جب راستہ معلوم ہو تو منزل تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔ حفیظ خان نے متعدد تاریخی اور تہذیبی حالات و واقعات کو ادبی انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ تاریخ، تہذیب، تمدن، سماجی رویوں اور انسانی عادات کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ قاری کا تعلق روایت اور ماضی سے مضبوط ہو جاتا ہے۔ اپنی تخلیقی صلاحیت اور فکری بصیرت کے ذریعے وہ ثقافتی، تہذیبی اور تاریخی پہلوؤں کو تحریر میں سمو کر پیش کرتے ہیں۔ وہ ماضی کی داستان کو مؤثر انداز میں بیان کرتے ہوئے قاری کو قیمتی معلومات فراہم کرتے ہیں اور تاریخی و تہذیبی زندگی کی ایک حقیقت پسندانہ تصویر سامنے لاتے ہیں۔ جیسے وہ رقم طراز ہیں:

"اسی نوے کے پیٹے میں سانس لینے والے جھریوں بھرے نبلو سانسی اور مٹھل ماچھی نے اپنی لرزتی ہوئی آواز میں سمجھانے کی کوشش کی کہ گوروں سے متھامت لگایا جائے۔ انہوں نے یاد دلایا کہ پچاس پچپن سال پہلے ملتان فتح کرنے کے بعد جب سکھوں نے ریاست بہاولپور پر چڑھ مار کی کوشش کی تو ان کی یہ یلغار انہی گوروں کی وجہ سے ناکام ہوئی تھی۔ نبلو سانسی کی سانس بے

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

شک پھول چکی تھی مگر اس نے ٹوٹتے ہوئے لفظوں میں کانپتے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا کہ گوروں کی حکم عدولی نہیں، بہت ہی بھیڑے لوگ ہیں جو سوچ لیں اس سے ٹلتے نہیں۔"(6)

ناول میں پنجاب کے دیہی ماحول کی تصویر کشی کرتے ہوئے حفیظ خان نے ان تمام پہلوؤں کو پیش کیا ہے جو گاؤں کی حقیقی جھلک قاری کے ذہن میں واضح کر دیتے ہیں۔ دیہاتی زندگی کو بیان کرتے ہوئے انہوں نے وہاں کے رہن سہن، سوچ بچار اور روزمرہ کے اندازِ حیات کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ لوگ کس طرح اپنی زندگی گزارتے تھے۔ کس محبت اور لگن سے وہ اپنے رہنے کے لیے گھر تعمیر کرتے تھے۔اس حوالے سے بیان کرتے ہیں:

"بستی میں موجود اس کے ساہہ نما مکان کا قبضہ کون لے گا جسے ابھی چند مہینے پہلے اس نے روہی سے مڑ بیچے بلوا کر بڑی چاہت سے تیار کروایا تھا۔ ساہہ کیا تھی، گرمی سردی سے محفوظ ایسی رہائش گاہ کہ جس کی اندرونی دیواریں چیکی مٹی سے اس طرح لیپ ہوئیں کہ آئینہ بن گئیں۔ چھت کے لیے بھی ٹاہلی کے بالے اور بالوں کے پیچ سچے سرگندھے گئے کہ طوفانی بارشوں میں بھی پانی کے قطرے تک کو اندر ٹپکنے کا راستہ نہ ملے۔"(7)

میلے ٹھیلے پنجابی ثقافت کی نمایاں پہچان ہیں، جہاں دیہاتی لوگ بڑی خوشی اور جوش کے ساتھ شرکت کرتے ہیں۔بستی آدم واہن کے رہنے والے کچھ حد تک توہمات پر یقین رکھتے ہیں مگر وہ مذہب سے گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ وہ اکثر اپنی سوچ اور سمجھ کو بروئے کار نہیں لاتے۔اس بستی میں ہر سال پیر زندہ کرامت کے عرس کا اہتمام کیا جاتا ہے، جس میں نہ صرف مقامی لوگ بلکہ آس پاس کے علاقوں کے افراد بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ شخصیت مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو اور بدھ مت کے ماننے والوں کے لیے بھی قابلِ احترام ہے۔ یہ تہوار ایک طرف روحانی عقیدت کا مظہر ہوتا ہے تو دوسری جانب تفریح کا ذریعہ بھی بنتا ہے، جہاں نذر و نیاز پیش کی جاتی ہے اور مختلف کھیل تماشوں کا بھی انعقاد ہوتا ہے۔اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"پیر زندہ کرامت کا نہ تو بستی میں کوئی مزار تھا اور نہ کوئی اور آثار یا یادگار مگر اس کے باوجود قرب وجوار کے شہروں کے علاوہ ملتان تک سے ان کے عقیدت مند دریا کے شمالی کنارے کے پتن پر

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

جمع ہوتے، نذر نیاز دی جاتی، قوالیوں کی محفلیں ہوتیں، نٹ اپنے تماشے دکھاتے، کشتی جوانوں کا جوڑ پڑتا، گسنی پکڑنے کے مقابلے ہوتے اور پھر تیسرے روز سورج غروب ہوتے وقت پتن میں موسمی پھول بہائے جانے کے بعد اجتماعی دعا کرائی جاتی اور یوں عرس کی تقریبات اختتام پذیر ہوتیں۔"(8)

عورت ہمیشہ سے ادب کا ایک مرکزی اور اہم موضوع رہی ہے، جسے سیاسی، سماجی، ثقافتی، مذہبی اور جمالیاتی ہر زاویے سے دیکھا گیا ہے۔ پنجابی معاشرے میں عورت کو محنتی، صابر، ہمدرد، باوقار اور دلیر کردار کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ وہ ماں، بہن، بیٹی اور شریکِ حیات کے مختلف روپوں میں اپنی زندگی دوسروں کے لیے وقف کیے رکھتی ہے اور مسلسل قربانیاں دیتی رہتی ہے۔ برصغیر کے کئی دوسرے خطوں کے مقابلے میں پنجاب کی عورت خاندانی نظام کے اندر رہتے ہوئے مشترکہ زندگی کو ترجیح دیتی ہے اور رشتوں کو نبھانے کو اہم سمجھتی ہے۔ تاہم جاگیردارانہ معاشرت میں بعض اوقات اسے ایسے حالات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے جہاں اسے ایک مرد کی متعدد بیویوں میں شامل ہو کر زندگی گزارنی پڑتی ہے، اور یوں وہ اپنی پوری عمر محدود ماحول میں بسر کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اس کے باوجود، چاہے دیہی پس منظر ہو یا شہری، پنجابی عورت میں خوداعتمادی اور سمجھ بوجھ کی کمی نہیں ہوتی۔ وہ زندگی کے مسائل کو نہ صرف محسوس کرتی ہے بلکہ ان کا حل نکالنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ گھریلو نظام میں اس کا کردار بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور اکثر وہی پورے گھر کے معاملات سنبھالتی ہے۔ ازدواجی زندگی میں بھی وہ اپنے حقوق اور مقام سے آگاہ ہوتی ہے اور اپنے فیصلوں پر قائم رہنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس ناول میں بھی ناول نگار نے نہ صرف مذہبی حوالے سے ثقافتی قانون کو اجاگر کیا ہے بلکہ عورت کی سماجی حیثیت کو بھی بیان کیا ہے۔

مصنف نے کردار نگاری کو نہایت مہارت اور خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ ناول میں سنگری کا کردار ابتدا سے آخر تک نمایاں رہتا ہے اور وہ مختلف سماجی مسائل میں گھری ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس کردار کے ذریعے معاشرے میں عورت کے مقام کو اجاگر کیا گیا ہے، خصوصاً ایسی عورت جو حسن رکھتی ہو مگر معاشی یا سماجی طور پر کمزور یا بے سہارا ہو۔ اس کے ساتھ روا رکھے جانے والے رویّوں اور ناانصافیوں کو بھی مؤثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ انہوں نے سنگری کے کردار میں ہمت دکھائی ہے جو معاشرے کے ستم کے باوجود اپنا استحصال کروانے کی بجائے مشکلات سے اپنا راستہ نکالنا چاہتی ہے۔ اس نے تمام حدوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے جینے کا ایک الگ ڈھنگ نکال رکھا تھا۔ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

"اپنی نگاہ میں وہ انواسی ہو کر بھی لاکھوں کنواریوں سے برتر تھی۔ اس راہ میں اسے کسی کی بھی پرواہ نہیں رہی تھی حتٰی کہ اپنی ماں کی بھی نہیں۔ جب سماج اور سماجی بندشیں اس نے اپنے پاؤں کی ٹھوکر تلے رکھ کر چھوڑی ہوں تو کسی کی بھی پرواہ کرنا بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ انواسی خواہشاً نہیں بلکہ جبراً ہوئی تھی لہٰذا اسے اس کی اخیر تک پہنچنے کے لیے مکر، فریب، حیلہ سب کچھ روا تھا۔ اب نہ تو اسے اپنے ریتی رواج کی فکر رہی تھی اور نہ ہی مذہب اور سماج کی۔"(9)

سنگری کو ایک باہمت اور مضبوط کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جو کڑے حالات کے باوجود جینے کا ہنر جانتی ہے۔ وہ اپنی زندگی میں آگے بڑھنے کے لیے خود راستے تلاش کرتی ہے اور اپنے مسائل کا حل نکالنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مرد کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر بھی روایتی سوچ سے مختلف ہے؛ اس کے نزدیک حقیقی مرد وہی ہے جو اس کی عزت کرے، صرف اس کے ظاہری حسن سے متاثر نہ ہو بلکہ اس کی اندرونی کیفیت اور جذبات کو بھی سمجھے۔ ناول میں سنگری کا کردار نہ صرف ثقافتی پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے بلکہ معاشرتی مسائل کی عکاسی بھی مؤثر انداز میں کرتا ہے اس کے متعلق ارشد محمود لکھتے ہیں:

"سب سے زیادہ شامت لڑکی ذات کی آتی ہے۔ اس کے معاملے میں یہ معاشرہ نہایت مجرمانہ خیالات کا حامل ہے۔ پاکیزگی، صلاحیت اور شرافت کے نام پر یہ لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتا ہے۔ اس فرسودہ تہذیب میں لڑکیوں کو جیسے کچلتے ہیں وہ جدید ذہن کے لیے بڑا ہی اذیت ناک ہے۔ اس معاشرے کے نزدیک اخلاق بڑا ہے انسان چھوٹا ہے۔"(10)

اسی تناظر میں مولوی بخشو کا کردار سامنے آتا ہے، جو اپنی سماجی حیثیت اور اختیار کو استعمال کرتے ہوئے ایک بے سہارا لڑکی کو دباؤ میں لانا چاہتا ہے۔ اسے یقین ہوتا ہے کہ اس کی بات کو سچ مان لیا جائے گا اور لڑکی اپنی مجبوریوں کے باعث اس کے آگے جھکنے پر مجبور ہو جائے گی۔ یوں وہ ایک ایسے دوراہے پر کھڑی ہوتی ہے جہاں مان لینے کی صورت میں بھی اس کا استحصال ہوتا ہے اور انکار کرنے پر بھی اس کے لیے اپنے اور اپنے بیٹے کے تحفظ کو یقینی بنانا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ صورتِ حال اس حقیقت کی عکاسی کرتی ہے کہ جب عورت کے پاس کوئی سماجی سہارا نہ ہو تو وہ استحصال کا آسان ہدف بن جاتی ہے۔ بہت سے معاشروں میں مرد کو طاقت اور تحفظ کی علامت سمجھا جاتا ہے، اور اسی نسبت سے

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

عورت کی حفاظت یا کمزوری کا تعین کیا جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں عورت کے ذاتی جذبات اور خواہشات کو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے، اور اسے اپنی ذات یا جسم پر مکمل اختیار بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اسی صورتِ حال کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "کتنی بدقسمت ہے عورت اس دھرتی کی کہ کسی مرد کی غیرت کے باڑے میں جنم لے کر آزادی اور چاہے جانے کے خواب دیکھتے ہوئے کبھی ہاری ہوئی جنگ کا تاوان بن کر کے قیمت چکاتی ہے اور کبھی اس کی اگلی نسل کی بڑھوتری کے ڈھکوسلے میں بار بار دیواروں میں چنوائی جاتی ہے، انانیت کے نام پر مصلوب ہوتی ہے اور تلذذ کی آڑ میں تذلیل جھیلتی رہتی ہے۔"(11)

ایک عورت جب ماں کے منصب پر فائز ہوتی ہے تو اس کی زندگی کا ہر زاویہ ایک نئے معنی اختیار کر لیتا ہے۔ وہی عورت جو کبھی اپنی خواہشات، اپنے خوابوں اور اپنی دنیا میں مگن تھی، اب اس کے ہر خیال میں ایک ننھی سی جان کی جھلک شامل ہو جاتی ہے۔ اس کی ترجیحات بدل جاتی ہیں، اس کی خوشیاں بدل جاتی ہیں، حتیٰ کہ اس کے دکھ بھی اب اپنے نہیں رہتے وہ سب کچھ اس ننھے وجود کے گرد گھومنے لگتا ہے۔ ماں بننے کا سفر صرف خوشیوں سے نہیں بھرا ہوتا، یہ ایک ایسا راستہ ہے جس میں جسمانی تکالیف بھی ہیں اور جذباتی آزمائشیں بھی۔ اس کے جسم میں ہونے والی تبدیلیاں محض ظاہری نہیں ہوتیں، بلکہ اس کے اندر ایک مکمل نظام خود کو ایک نئی زندگی کے مطابق ڈھال رہا ہوتا ہے۔ ہر چیز میں احتیاط اور ذمہ داری شامل ہو جاتی ہے۔ پھر وہ وقت بھی آتا ہے جب درد اپنی انتہا کو چھو لیتا ہے۔ ایک ایسا درد جسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں، مگر وہی درد ایک نئی خوشی کی ابتدا بھی ہوتا ہے۔ ماں اس تکلیف کو برداشت کرتی ہے، کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد جو ملنے والا ہے، وہ دنیا کی سب سے قیمتی نعمت ہے۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب ایک عورت صرف عورت نہیں رہتی، بلکہ ماں بن جاتی ہے ایک ایسا رتبہ جو دنیا کے ہر رتبے سے بلند ہے۔ اس ناول میں بھی سنگری کے کردار کے حوالے سے دیکھا جائے تو جب وہ ماں بن جاتی ہے تو صرف اپنے بچے کی حفاظت کے لیے مولوی سے شادی کرنے پر رضامند ہو جاتی ہے اگرچہ یہ فیصلہ اس کی ماں کے لیے قبول کرنا آسان نہیں ہوتا لیکن بیٹی کی رضامندی کے لیے وہ بھی اس شادی کے لیے تیار ہو جاتی ہے اس صورتِ حال کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "سنگری کے چہرے کے تاثرات نے اب تک کی تمام گرہیں اپنی ماں پر کھول دی تھیں۔ ملوکاں کو اب احساس ہو رہا تھا کہ اس نے مولوی صاحب سے شادی کیوں کی اور کس واسطے کی۔ اگرچہ ملوکاں کے لیے یہ اب تک راز ہی تھا کہ سنگری حاملہ کیسے ہوئی مگر اتنا تو وہ بھی جانتی تھی کہ عورت

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

ذات کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ وہ حاملہ کیسے اور کس سے ہوئی؟ بس ایک بار نطفہ ٹھہر جائے تو وہ اس کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کرتی ہے۔ عورت کی زندگی میں یہی وہ مقام ہوتا ہے کہ جہاں وہ کائنات یعنی نسل انسانی کی بڑھوتری سے جڑ رہی ہوتی ہے۔ سنگری اپنی خواہش سے حاملہ ہوئی یا حادثاتی طور پر دونوں صورتوں میں اسے اپنے پیٹ میں موجود بچے کی نگہبانی کرنا تھی تاوقتیکہ وہ پیدا نہ ہو جاتا۔"(12)

پنجابی ثقافت کے معاملات اور اس سے جڑے رسم و رواج کو بڑے بہترین طریقے سے بیان کرتے ہوئے ان کے رہن سہن اور سماجی معاملات کو بھی تفصیل سے پیش کیا ہے۔ جس سے اس ثقافت کو سمجھنے میں کافی حد تک معاونت ملتی ہے۔ دریا کنارے آباد بستیاں چونکہ دور افتادہ ہوتی ہیں اس لیے یہ پسماندگی اور محرومیوں کا شکار رہتی ہیں۔ یہاں کے باسیوں کے نزدیک مال مویشی کی چوری، جوان لڑکیوں کا اغواہ معمولی سی بات ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسا معاشرہ جب اپنے ہاں لڑکی کو اغوا کے خلاف تحفظ فراہم کرنے میں ناکام رہتا ہے تو وہ لڑکیوں کو پیدا ہوتی ہے کسی مرد کے ساتھ منسوب کر دیتا ہے اور ان کی عزت اور عصمت کی حفاظت کے ذمہ داری ہر ممکن جلدی میں کسی طرح تنومند مرد کو سونپ دی جاتی ہے۔ اس صورتِ حال کی عکاسی یوں کی گئی ہے:

"دریاؤں کے کنار آباد بستیوں میں دو طرح کے جرائم اتنی کثرت سے ہوتے ہیں کہ اپنی حساسیت کھو بیٹھتے ہیں۔ ان کی بہتات کے سبب سماجی معمولات کا جزو سمجھ لیے جانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہتا ان میں سر فہرست رسہ گیری یعنی مال مویشی کی چوری اور بازو نکالنا یعنی جوان عورتوں کا اکثر بالرضا اور کبھی کبھار جبراً بھگا لیا جانا۔ مال مویشی چونکہ دریائی بستیوں کی معیشت کی بنیادی اکائی سمجھے جاتے ہیں اس لیے معاشرتی اکائی یعنی بازو کا اغوا ہو جانا اتنا کاری وار نہیں گردانا جاتا جتنا کہ گائے بھینس کا چوری ہو جانا۔ دیگر دریائے بستیوں کے ساکنان کی طرح آدم واہن کے باسیوں کو یقین تھا کہ جس طرح بڑے بڑے زرخیز تھنوں اور لانبی سیاہ آنکھوں والی چٹی گوری لڑکیاں اغوا ہو کر ہی رہتی ہیں اسی طرح لشکارے مارتی سیاہ بھینس اور دودھ سے بھرے تھنوں والی گائیں بھی پرایا دھن ہی ہوتی ہیں۔"(13)

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

حفیظ خان نے ناول "انواسی" میں پنجاب کی تہذیب اور روایات کو بیان کرنے کے لیے پنجابی لوک کہانی کا سہارا بھی لیا ہے۔ انہوں نے پنجابی تہذیب کے مختلف رنگ دکھانے کے لیے ایک ایسی داستان کا ذکر کیا ہے جو وہاں مقبول عام تھی۔ یہ ایک فرضی قصہ ہے جو کہانی میں دلچسپی بڑھانے اور پنجاب کی تہذیب اور ثقافت کو بیان کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ اس کا تعلق پیر زندہ کرامت سے ہے۔ دریائے ستلج کے نشیبی علاقوں میں ایک بزرگ ہستی کو لوگوں کے درمیان خاص عقیدت اور احترام حاصل تھا۔ روایت ہے کہ ایک زمانے میں اس خطے پر سخت قحط نازل ہوا۔ باغات ویران ہو گئے، کھیتوں میں فصلیں نہ اُگ سکیں اور اناج کی شدید کمی پیدا ہو گئی۔ حالات اس قدر خراب ہو گئے کہ عورتوں کے حمل بھی ضائع ہونے لگے۔ اہلِ علاقہ نے دعاؤں، صدقات اور توبہ استغفار کا سہارا لیا، مگر مصیبت کم نہ ہوئی۔

انہی دنوں ایک نورانی چہرے والے درویش کا ذکر عام ہوا، جنہوں نے دریائے ستلج کے کنارے ایک پتن پر قیام کیا ہوا تھا۔ وہ زیادہ تر خاموشی اور گہری روحانی کیفیت میں رہتے۔ ان کے ہاتھ میں بڑی بڑی دانوں والی تسبیح مسلسل گردش کرتی رہتی تھی۔ دنیاوی خواہشات اور لالچ سے وہ بالکل بے نیاز دکھائی دیتے تھے۔ لوگ ان کے گرد جمع ہوتے، کچھ دیر بیٹھتے اور واپس چلے جاتے، مگر وہ اپنی کیفیت میں اس طرح محو رہتے کہ گویا انہیں اردگرد کے حالات کا احساس ہی نہ ہو۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی روحانی ریاضت یا چلہ کشی میں مصروف ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے قیام کا ساتواں دن تھا۔ شام کے وقت، سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے جب لوگ دوبارہ پتن پر پہنچے تو وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ جو افراد دریا کے دوسرے کنارے سے آئے تھے، وہ بھی اس بارے میں کچھ واضح نہ بتا سکے۔ تاہم فضا میں پھیلی خوشبو اس بات کا احساس دلا رہی تھی کہ وہ بزرگ ابھی کچھ دیر پہلے تک یہاں موجود تھے۔ ماحول پر ایک عجیب سحر طاری تھا؛ دیکھنے والوں کی زبانیں خاموش اور آنکھیں حیرت سے جمی ہوئی تھیں۔ بعد ازاں اسی پراسرار بزرگ کو لوگ "زندہ پیر" کے نام سے یاد کرنے لگے۔

> "بزرگ کے گزرنے پر معلوم ہوا کہ بستی سمیت میں ستلج کے بہاؤ کے علاقوں پر سختی کے دن اب نہیں رہے۔ فصلوں کی بالیوں میں اناج لوٹ آیا، پھل دار درختوں پر بور بھی لگا، پھول کھلے تو پھل لگنا بھی شروع ہو گیا، ستلج میں پلی پلائی مچھلیاں تیرنے لگیں اور گبھن عورتوں نے نویں مہینے تک پہنچ کر بچوں کو جنم دینا شروع کر دیا۔ رُت بدلی تو زندہ پیر کا نام بھی "پیر زندہ کرامت" ہو گیا پھر ہر سال ان کا عرس اسی دن کی مناسبت سے منایا جانے لگا جس روز انہوں نے پتن سے اپنا پڑاؤ کسی نامعلوم مسافت کی جانب اٹھا لیا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ کب کا واقعہ تھا مگر نسل در نسل ہر کوئی

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

اسے اپنے باپ دادا سے سنتا چلا آ رہا تھا۔ جس طرح پیر زندہ کرامت کی اصل پہچان کے بارے میں کوئی بھی تیقن سے کچھ نہیں جانتا تھا اسی طرح ان کا عرصہ پڑاؤ بھی اسرار کے پردے میں پوشیدہ تھا۔"(14)

پنجابی الفاظ کے استعمال نے ناول کی ادبی اہمیت اور تاثیر میں نمایاں اضافہ کیا ہے، تاہم ایسے قارئین کے لیے جو پنجابی زبان سے مکمل یا جزوی طور پر واقف نہیں، یہ الفاظ بعض اوقات متن کو سمجھنے میں دشواری پیدا کرتے ہیں، خصوصاً وہاں جہاں خالص اور مقامی پنجابی تراکیب استعمال ہوئی ہیں۔ اس کے باوجود اسے خامی قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ یہی اندازِ بیان مصنف کے اسلوب کی شناخت بنتا ہے۔ حفیظ خان نے اردو نثر میں پنجابی الفاظ کو اس مہارت سے شامل کیا ہے کہ وہ اجنبی محسوس نہیں ہوتے بلکہ عبارت کا فطری حصہ دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں یہ الفاظ غیر ضروری یا بے محل نہیں لگتے بلکہ معنی اور فضا کو مزید مؤثر بناتے ہیں۔ پنجابی زبان اپنی قدامت اور وسیع ذخیرۂ الفاظ کے اعتبار سے ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں ایسے متعدد الفاظ پائے جاتے ہیں جن کے ہم معنی یا مکمل متبادل اردو میں دستیاب نہیں۔ اس فرق کی بنیادی وجہ دونوں زبانوں کے بولنے والوں کی تہذیبی روایات، رہن سہن اور معاشرتی انداز کا اختلاف ہے۔ چونکہ دونوں زبانیں جداگانہ ثقافتی پس منظر رکھتی ہیں، اس لیے ان کی لفظیات اور اظہار کے انداز بھی مختلف ہیں۔ حفیظ خان نے اسی تہذیبی اور لسانی فرق کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک ایسا منفرد اسلوب اختیار کیا ہے جس میں اردو اور پنجابی کا حسین امتزاج نمایاں نظر آتا ہے۔ بالخصوص پنجاب کے دیہی ماحول، ثقافت اور روزمرہ زندگی کی عکاسی کرتے وقت پنجابی الفاظ نہ صرف تحریر میں دلکشی پیدا کرتے ہیں بلکہ مقامی معاشرت کو زیادہ حقیقی انداز میں سمجھنے میں بھی مدد دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ناول نگاری میں پنجابی زبان کے الفاظ کثرت سے دکھائی دیتے ہیں اور ان کے فن کا اہم حصہ بن جاتے ہیں۔

"اڑبنگی میں سیدے کا باپ بھی سیدے سے کم نہیں تھا۔ خواہ مخواہ ہر کسی کے پھڈے میں ٹانگ اڑائے رکھنا اس کا مزاج تھا۔ نکھیرو کی ابھی مس بھی مشکل سے بھیگی ہوگی کہ اس نے سانسیوں کی ملکوڑی چھوہر نکال لی اور اسے جلال پور کے کسی زمیندار کے پاس بیچ آیا۔ شک چونکہ سبھی کو نکھیرو پر تھا اس لیے پنچایت نے وٹہ بھرنے کا ڈنڈ نکھیرو کے باپ پر ڈال دیا۔ اب نکھیرو کی نہ تو کوئی بہن اور نہ ہی بوا لہٰذا رواج کے مطابق اس کی چچازاد بہن ڈنڈ کے طور پر سانسیوں کو دینا پڑی۔ بات پھر

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

بھی یہاں نہ رکی۔ اب نگیھرو نے سانسیوں سے انتقام لینے کا ایک اور طریقہ سوچا اور جلال پور کے اسی زمیندار کو اکسایا کہ مخبری وہ کرے گا لیکن سانسیوں کی دو بلہن مچھی جیسی دوشیزائیں نکالنا اس کا کام چاہے خود آئے یا کوئی کاٹکو ملازم بھیجے۔"(15)

اس ایک پیراگراف سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ پنجابی الفاظ کے اس روانی سے استعمال نے تحریر کو متاثر کرنے کے بجائے دیہات کی تہذیب کے حوالے سے اس کی معنویت میں اضافہ کیا ہے۔ اس ناول میں موجود پنجابی الفاظ کی فہرست بنائی جائے تو وہ خاصی طویل ہو گی۔ ماچے، پیڑھی، وڈکوں، مچھی، متھا، بھیڑے لوگ، جد، منڈھ، ونکو ونک، دیگر ویلے، چڑھدے، کھنڈ، چِٹے لٹھے، تپتے ہاڑ، مونڈھا، سنگیوں، دھی، ماچھیوں کی چھوہر، مکلانا، ملوکڑے وجود، سوہنی سونی، گبھن، منجھلی، بلہن مچھی، ویلا، بھوتروں، ملے، ونج، چٹے، شودی، چڑے چرواکر، مسات، پواندی، جندرہ، کوٹھا، تھاپا، کتے یدی، نکے لا، ناںواں ڈالنا، توئے توئے کرنا، مائی مویا، مچکنا، پدھرا، ڈھینگر، کاور، پگ ونڈ، لکھ، ماکھی، دھی چود، دھادنی گھوڑی، لتر پولے، مبارخی، پتیلے وغیرہ جیسے سینکڑوں الفاظ ناول میں موجود ہیں۔

محمد حفیظ خان کا شمار دیہاتی طرزِ معاشرت اور تہذیب و ثقافت کی عکاسی کرنے والے چند بڑے ناموں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں دیہی طرزِ زندگی اور تہذیب و تمدن کو اجاگر کیا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جو ان کے کرداروں کی زبان ہے۔ پنجاب کا مخصوص لہجہ اور لفظیات ان کی تحریروں کے لطف کو دوچند کر دیتا ہے۔ انسانی اقدار ہر معاشرے کی بنیاد سمجھی جاتی ہیں، اور وہ معاشرہ جہاں ان اقدار کا احترام نہ کیا جائے زیادہ عرصے تک اپنے توازن اور استحکام کو قائم نہیں رکھ پاتا۔ مجموعی طور پر اس ناول میں حفیظ خان نے پنجاب کی ثقافت کو بھرپور انداز میں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ مذہبی، سماجی اور معاشرتی مسائل کی بھی نہایت مؤثر اور خوبصورت عکاسی کی ہے۔ انہوں نے پنجاب کے ثقافت کا انگریز ثقافت کے ساتھ تقابل بھی پیش کر دیا ہے جس سے اس دھرتی کی ثقافت کی جان اور اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اس ناول کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اپنے موضوعات اور فن کے لحاظ سے "انواسی" دنیائے فکشن نہیں بلکہ انسانی اذہان کی تاریخ میں ایک نیا تناظر لے کر سامنے آتا ہے۔ بلا مبالغہ اردو ناول کی روایت میں حفیظ خان ایک رجحان ساز ناول نگار ہیں۔

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

حوالہ جات

۱۔ عرش ملیسانی، بالمکند، مترجم، قدیم ہندوستان کی ثقافت و تہذیب، تاریخی پس منظر میں، از ڈی ڈی کوسمبی، لاہور: فیمس بک ڈپو، ۱۹۹۸ء، ص:۲۳

۲۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، دائرے اور لکیریں، لاہور: مکتبہ فکر و خیال، ۱۹۸۶ء، ص:۸۰

۳۔ محمد حفیظ خان، انواسی، جہلم: بک کارنر، ۲۰۱۹ء، ص:۱۴

۴۔ عبداللہ، سید ڈاکٹر، کلچر کا مسئلہ، لاہور: علمی پرنٹنگ پریس، ۱۹۷۷ء، ص:۸۴

۵۔ محمد حفیظ خان، انواسی، ص:۸۱

۶۔ ایضاً، ص:۱۴

۷۔ ایضاً، ص:۱۲۹

۸۔ ایضاً، ص:۵۰

۹۔ ایضاً، ص:۳۲۳

۱۰۔ ارشد محمود، ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ، کراچی: سٹی پریس، ۲۰۱۲ء، ص:۴۰

۱۱۔ محمد حفیظ خان، انواسی، ص:۱۲۵

۱۲۔ ایضاً، ص:۱۷۵

۱۳۔ ایضاً، ص:۲۵

۱۴۔ ایضاً، ص:۵۱۔۵۲

۱۵۔ ایضاً، ص:۵۳